ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154

Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

پاکستان میں انتخابی سیاست، اسلامی تعلیمات اور ممکنہ اصلاحات

ڈاکٹر وجاہت خان
سید مدثر علی گردیزی
لیکچرر اسلامیات یونیورسٹی آف کوٹلی آزاد کشمیر wajahat_iiui@yahoo.com
لیکچرر اسلامیات یونیورسٹی آف کوٹلی آزاد کشمیر Syedm1160@gmail.com

Abstract

This paper examines the current political and electoral system of Pakistan with reference to Islamic political thought. The study has been conducted from a Pakistani perspective; therefore, only the views of Pakistani authors and scholars have been quoted and considered as references. The study reveals that the democratic system has not delivered in Pakistan due to multiple factors. The Election Commission of Pakistan is identified as a contributor to this issue, as it tends to appoint incompetent and inexperienced individuals who are incapable of bringing about major political reforms in the country. The study suggests that the parliamentary democratic system of the country may be replaced with a presidential system, in addition to implementing valuable changes in the electoral process.

Keywords: Shura, Election, Pakistan, Politics, Democracy, President.

ریاست، کسی خاص علاقہ میں منظم نظام کے تحت، آزاد انسانی آبادی ہے جناب رسول کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اسلام میں ریاست کا حصول خود مقصود نہیں ہے بلکہ ریاست کی حیثیت ایک وسیلہ کی سی ہے جس کی مدد سے مسلمان اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بہت سارے اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہوں اور اخلاقی اقدار کو تحفظ دے سکیں۔ ممتاز مذہبی رہنما ڈاکٹر محمود غازی اسلامی ریاست کے قیام کے متعلق لکھتے ہیں: ''اصل مقصود امت کی تشکیل و تربیت ہے لیکن ریاست کی قوت بھی امت کے لیے درکار ہے۔ امت کی مدد کے لیے ریاست کی قوت موجود ہو گی تو امت کو بہت سارے کاموں میں آسانی ہو گی اور امت کا تحفظ آسان ہو جائے گا''[1]۔ اگرچہ اسلام میں ریاست خود مقصود نہیں ہے لیکن ریاست اور اسلام کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اسلامی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر مسلم ریاستوں کا آغاز دینی محرکات کی وجہ

[1] غازی، محمود احمد، محاضرات فقہ (www.KitaboSunnat.com)، 360-

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

سے ہوا۔ جب دینی محرک مضبوط رہا حکومتیں مضبوط رہیں اور جب یہ محرک کمزور پڑ گیا تو ریاست کی بنیادوں میں کمزوری رونما ہوئی[2]۔ اسلامی ریاست کی چار بنیادی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ ذمہ داریاں نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: **الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ** ۗ[3]

اسلام میں حکمران کے چناؤ کا طریقہ کار

اسلامی ریاست کا حکمران خلیفہ کہلاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی قائم کی ہوئی ریاست میں آپ ﷺ کے وصال کے بعد پہلے چار جانشین، خلفائے راشدین کے نام سے مشہور ہوئے یہ افراد براہ راست آپ ﷺ کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے ریاستی اور سیاسی امور میں آپ ﷺ کی تعلیمات کی اتباع کی ان افراد کا تقرر ارباب بست و کشاد کی اجازت اور عامۃ الناس کی رضامندی سے ہوا یہ افراد حکومتی معاملات میں صاحبان بصیرت سے مشاورت کرتے تھے اور اپنے آپ کو خدا اور خلق کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے اس دور میں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی حاصل رہی، بیت المال قومی خزانہ سمجھا گیا، عدالتیں اپنے فیصلوں میں آزاد تھیں اور قانون کی نظر میں تمام افراد برابر تھے[4]۔ اسلام کی نظر میں، صاحب ایمان اور متقی شخص خلافۃ الارض کا صحیح حقدار ہے اسلام اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اپنے لیے عہدہ طلب کرے یا اس بابت اپنی تشہیر کرے مگر حالات ایسے ہو جائیں جیسا کہ مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے تھے، تو ان حالات میں اہل افراد کے لیے جائز ہے کہ وہ مصلحت عامہ کی خاطر اپنے آپ کو حصول اقتدار کی خاطر پیش کریں چنانچہ بغیر عہدہ طلبی کے اگر کسی شخص کو کوئی عہدہ یا ذمہ داری سونپ دی جائے تو وہ اپنے جملہ فرائض کے سلسلے میں اللہ اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے ضروری ہے کہ اسے ارباب حل وحقد کی حمایت حاصل ہو اور عامۃ الناس بیعت کے ذریعے اس شخص پر اعتماد کا اظہار کریں جناب رسول اکرم ﷺ نے اپنے بعد صریحا کسی شخص کو جانشین مقرر نہیں فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام سب سے پہلے خلافت کے لیے پیش کیا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام خلافت کے لیے اپنے بعد تجویز فرمایا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات پر اس رائے سے صحابہ نے اتفاق کیا، یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقرر بطور خلیفہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے چھے معتمد رفقاء پر اپنی وفات کے بعد خلیفہ چننے کی ذمہ داری عائد کی ان افراد نے اتفاق رائے سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا خلیفہ نامزد کیا اور آپ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے خلیفہ بننے کی درخواست کی اور اصرار کیا کہ اس موقع پر ان سے زیادہ خلیفہ بننے کا کوئی اور حقدار نہیں، صحابہ کرام کے اصرار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد تشریف لے گئے جہاں مجمع عام نے آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ مولانا مودودی صاحب کی رائے میں خلیفہ کا انتخاب عوام کی رضامندی پر منحصر ہے مسلمانوں کی رضامندی کیسے حاصل ہو؟ اس کا کوئی خاص طریقہ مولانا کے کے نزدیک اسلام نے متعین نہیں کیا ہے۔ حالات اور زمانہ کے اعتبار سے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس طریقہ سے یہ معلوم ہو پائے کہ عوام کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے[5]۔ ڈاکٹر وحید حسین عشرت اسلام میں خلیفہ کے چناؤ کے طریقہ کار کے متعلق لکھتے ہیں: خلافت اسلام میں بیعت کے ذریعے سارے مسلمان شریک ہوئے بیعت کے ذریعے ہی خلیفہ کا

---

[2] ایضا، محاضرات شریعت (www.KitaboSunnat.com)، 289-

[3] الحج: 41۔

[4] مودودی، مولانا، شہادت امام حسین (مولانا مودودی نے یہ تقریر لاہور میں شیعہ، سنی حضرات کی مشترکہ نشست میں کی۔ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور نے جولائی ۱۹۶۰ میں اسے شائع کیا)، 8-15 ۔

[5] ایضا، اسلامی ریاست (اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور پاکستان)، 362 -363-

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

تقرر مکمل ہوتا مدینہ اور مکہ اس دور میں مسلمانوں کا اساسی انتخابی حلقہ تصور ہوتے پھر بلاد اسلامیہ سے اس اساسی حلقہ میں ہونے والی بیعت کی توثیق ہوتی ذرائع ابلاغ و رسل و رسائل کی قلت کے باوجود مسلمانوں نے اپنے سیاسی، سماجی اور اجتماعی معاملات میں بیعت کے تصور کو متعارف کروایا انسانی تاریخ میں ایک نیا تجربہ اور سیاسی انقلاب تھا مسلمان حکمران کے چناؤ کے اس شاندار طریقہ کو جاری رکھتے تو انسانی تاریخ میں ایک تاریخ ساز انقلاب کی پرورش ہوتی۔[6] ڈاکٹر وحید حسین عشرت کا یہ کہنا بجا ہے کہ اسلامی دنیا میں بیعت کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب اور حکومتی معاملات میں شورائی طریقہ کار زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا، جلد ہی ملوکیت نے اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شخصی موروثی حکومتیں قائم ہونے لگیں بیت المال عوامی مال کے بجائے شاہی خزانہ بن گیا، مطلق العنانی نے شورائیت کی جگہ لے لی، حکومتی افراد قانون سے مستثنیٰ ٹھہرے، عوام پر ظلم وزیادتی کے دروازے کھلے آمریت کا دور سیاہ آج بھی بیشتر مسلم ریاستوں پر مسلط ہے۔

اسلام کا شورائی نظام

اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ حکمران، ریاستی معاملات میں مجلس شوریٰ سے مشاورت کرے قرآن حکیم اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[7]۔ خود جناب رسول اکرم ﷺ اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں آپ ﷺ کی مجلس شوریٰ میں سابقین اولین شامل تھے اور نئے اسلام لانے والے بعض افراد بھی اپنی خدمات، بصیرت اور قربانیوں کے باعث مجلس شوریٰ کا حصہ بنے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو جن لوگوں کی کاوشوں سے مدینہ منورہ میں اسلام پھیلا اور سیاسی نظام میں مقامی لیڈروں کی پوزیشن پر فائز ہونے والے لوگ تیسرے عنصر کی حیثیت سے مجلس شوریٰ میں شامل ہوئے مزید برآں مدینہ منورہ میں مزید دو طرح کے لوگ مجلس شوریٰ کے لیے سامنے آئے ایک وہ جنہوں نے کئی سال تک فوجی، تبلیغی اور سیاسی مہمات میں خدمات انجام دیں اور دوسرے وہ افراد جو قرآن فہمی اور دین میں فقاہت کے اعتبار سے معتبر سمجھے جاتے تھے[8] ڈاکٹر محمود غازی کی رائے میں مجلس شوریٰ میں تین طرح کے افراد شامل رہے ہیں: پہلے اہل علم و دانشور، دوسرے مختلف علاقوں اور جماعتوں کے زعماء، تیسرے وہ افراد جو اپنی خدمات، اخلاص یا شخصی صلاحیت یا کسی بھی اعتبار سے عوام میں امتیازی حیثیت کے مالک رہے ہیں[9]۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کا کہنا ہے: شوریٰ کے لیے وہ تمام لوگ بلائے جاتے جو اپنے عوام کے معتمد لیڈر تھے اور دینی اور دنیاوی معاملات میں بصیرت رکھنے والے مسلمانوں کے سربراہ کار تھے ان افراد کے درمیان جوان اور بوڑھوں کی تخصیص نہ تھی انتخابات کے طریقے اس دور میں روشناس نہیں تھے اس لیے یہ افراد سیاسی مفہوم میں قوم کے منتخب نمائندے تو نہیں تھے لیکن اپنے گروہوں کے معتمد نمائندے ضرور تھے اور گروہی معاملات میں لوگ ان سے ہی رجوع کرتے تھے[10]۔ شوریٰ سے مشاورت کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہو اور امام کا تقرر عوامی رضامندی سے کیا جائے مشورے کے لیے وہی لوگ مقرر ہوں جنہیں قوم کا اعتماد حاصل ہو، مشورہ دینے والے صحیح رائے کا اظہار کریں، جو فیصلے اہل شوریٰ کے اجماع سے منعقد ہوں یا جنہیں جمہور کی تائید حاصل ہو انہیں تسلیم کیا جائے[11]۔ اس بارے میں مولانا تقی عثمانی کا موقف ہے کہ شوریٰ کا فیصلہ اس وقت معتبر قرار پاتا ہے جب کسی ایک رائے پر اہل شوریٰ متفق ہوں یا جمہور کے درمیان اتفاق رائے پایا جائے[12]۔

---

[6] عشرت، وحید ڈاکٹر، جمہوریت پاکستان میں (یونیورسل اردو بازار لاہو، سن اشاعت: ۱۹۸۷)، 68۔

[7] الشوریٰ: 38

[8] مودودی، مولانا، اسلامی ریاست، 363-365۔

[9] غازی، محمود احمد، محاضرات شریعت، 291-292۔

[10] اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست (دار التذکیر اودو بازار لاہور)، 45۔

[11] انصر عمری، اسلام کا شورائی نظام، مقدمہ از مولانا مودودی، 15-16۔

[12] عثمانی، تقی مفتی، اسلام اور سیاسی نظریات (مکتبہ معارف القرآن، کراچی نومبر ۲۰۱۰)

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

اسلام نے شوری کے انتخاب کا خاص طریقہ مقرر نہیں فرمایا ہے، یہ فیصلہ ہر دور کے اہل بصیرت حضرات کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ زمانے اور حالات کے تقاضوں کے تحت ان افراد کا انتخاب کریں ضروری نہیں کہ ان افراد کی کوئی باقاعدہ کمیٹی یا اسمبلی ہو جس کے وہ ارکان مقرر ہوں اور ہر معاملہ میں انہی سے مشورہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے امام شوری کے کچھ افراد سے خاص معاملہ میں مشورہ کرے اور دوسرے ارکان سے کسی دوسرے معاملہ میں رجوع کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ امام لوگوں کے ایک گروہ کو بلا کر ایک موضوع پر ایک وقت میں مشورہ کرلے اور کبھی دوسرے گروہ سے دوسرے وقت میں، کسی دوسرے موضوع پر مشورہ کرلے اور یہ بھی بعید نہیں کہ لوگوں کی صلاحیتوں کے تحت ان سے مشورہ کیا جائے۔ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں شوری کے لیے باقاعدگی سے کوئی مجلس نہیں بنائی گئی تھی جیسے آج کل اسمبلی کے ارکان چنے جاتے ہیں، بلکہ سادگی سے شوری کے اصولوں پر عمل ہوتا تھا[13]۔ مولانا مودودی کی رائے میں اہل شوری کے انتخاب کے لیے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے تمام طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں انتخابات بھی کروائے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ان میں وہ مکروہ دھندے استعمال نہ کیے جائیں جن کے باعث جمہوریت مذاق بن گئی ہے[14]۔ اس بارے میں مفتی منیب الرحمن فرماتے ہیں: اسلام نے اجتماعی معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے کا حکم دیا ہے۔ مجلس مشاورت کن لوگوں پر مشتمل ہو یہ معاملہ مسلمانوں کے اجتماعی دانش پر چھوڑ دیا گیا ہے اس معاملہ میں اگر کوئی حتمی طریقہ کار طے کر لیا جاتا تو ہو سکتا تھا آنے والے دور میں وہ قابل عمل نہ رہتا اس لیے اسلام نے اس معاملہ میں لچک دکھائی ہے اور انسانی فہم کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اسی لچک کی وجہ سے اسلامی تعلیمات ہر دور میں قبل عمل ہیں۔[15]

شورائی نظام میں چوں کہ فیصلے باہمی مشاورت سے ہوتے ہیں اس لیے ان فیصلوں میں درستی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اگر کسی فیصلہ میں کوئی نادانستہ غلطی سرزد ہو جائے تو اس کی ذمہ داری فرد واحد کے بجائے تمام افراد پر عائد ہوتی ہے۔ مولانا مودودی شورائی نظام کی افادیت کے متعلق لکھتے ہیں: اجتماعی معاملات میں کوئی شخص دوسروں کی آراء کو نظر انداز کرتے ہوئے خود فیصلہ کر سکتا ہے لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں دوسروں سے رائے لی جائے یہ بھی ہو سکتا ہے ایک شخص دوسروں کی رائے کو حقیر تصور کرے جو کہ غیر عادلانہ رویہ ہے اجماعی رائے سے کسی مسئلہ کے صحیح حل کا احتمال زیادہ رہتا ہے اور گر کسی معاملہ میں نادانستہ غلطی سرزد ہو جائے تو فرد واحد کو اس غلطی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ اس معاملہ میں تمام متعلقہ افراد برابر کے شریک ٹھہرتے ہیں[16]۔ ڈاکٹر محمود غازی اسلام کے شورائی نظام کی افادیت کے متعلق لکھتے ہیں: شوری کے لفظی معنی شہد کے چھتے سے شہد نکالنے کے ہیں شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں سے رس چوستی ہیں ہر پھول کی الگ خوشبو اور طبّی فوائد ہونے کے باعث شہد اجتماعی رزق اور شفا بن جاتا ہے امت مسلمہ کو شوری کا عمل اختیار کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ افراد کی دانائیوں کے مرکب سے پوری امت مستفید ہو پائے یہ تب ہی ممکن ہے جب ہر فرد کو رائے کا اختیار دیا جائے اور اجتماعی دانائی کی تلاش کی جائے اور انفرادی بنیادوں پر مستبدانہ فیصلوں کی جگہ اجتمائی بنیادوں پر فیصلے صادر ہوں[17]۔ حاکم وقت کے لیے شوری کے فیصلوں کی پاسداری لازمی ہے کہ نہیں؟ اس بارے میں علامہ یوسف قرضاوی کی رائے ہے کہ امیر کا شوری سے مشورہ کرنا ان سے مشورہ ماننے پر پابند نہیں کرتا اقلیت یا اکثریت جس کسی کا فیصلہ حاکم بہتر سمجھے اپنی دانست میں اختیار کرے۔ بعض علماء کے نزدیک حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوری کے فیصلے پر عمل درآمد کرے لیکن انتظامی اور فروعی معاملات میں امیر شوری سے مشورہ لینے کے بعد ان کی رائے کا پابند نہیں۔ بعض علماء کے نزیک یہ حالات پر منحصر ہے اگر امت حاکم کو شوری کے مشورے کا پابند بنانا چاہے تو بنا سکتی ہے اور اسے

---

[13] ایضا، 249-250۔

[14] مودودی، مولانا، اسلامی ریاست، 366۔

[15] منیب الرحمن مفتی، روزنامہ دنیا۔ لاہور، شمارہ اول، تاریخ اشاعت: 01-01-2022

[16] انصر عمری، اسلام کا شورائی نظام، مقدمہ از مولانا مودودی، 15-16۔

[17] غازی، محمود احمد

، محاضرات فقہ، 380۔

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

اگر مکمل اختیار اور آزادی دینا چاہے تب بھی اس معاملہ میں کوئی قباحت کی بات نہیں ہے[18]۔اس بارے میں مفتی تقی عثمانی صاحب کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے۔مفتی صاحب کے نزدیک اگر امیر مجتہدانہ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے علاوہ امین، متقی اور تجربہ کار بھی ہو تو امیر کو شورائی فیصلوں کا پابند نہ بنانا درست دکھائی دیتا ہے اور اگر امیر مذکورہ بالا صفات سے متصف نہ ہو تو قانون سازی کے دائرے میں اسے شوری کے مشورے کا پابند بنایا جاسکتا ہے مگر ان حالات میں امیر کو انتظامی اور تنفیذی نوعیت کے احکام اپنی صوابدید کے مطابق حل کرنے کا اختیار دیا جاسکتا ہے[19]۔

شورائی اور جمہوری نظام میں فرق

جمہوری نظام میں انتخابات کے ذریعے ملک و قوم کے نمائندوں کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ نمائندے ایک مربوط نظام کے تحت حکومتی معاملات باہمی مشاورت سے چلاتے ہیں جمہوری نظام میں سپریم اتھارٹی پارلیمنٹ ہے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین نہ کسی دوسرے فورم پر چیلنج ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے خلاف قانون سازی ہوتی ہے، سیاسی جماعتیں جمہوری سسٹم کا لازمی جزو مانی جاتی ہیں، مغربی جمہوریت میں کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ اکثراوقات پارٹی پالیسی کے تحت کیا جاتا ہے۔اسلامی تعلیمات میں بھی جمہوریت کی روح دکھائی دیتی ہے جب کہ مسلمانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں لیکن اسلامی طرز سیاست میں سپریم اتھارٹی، قرآن وسنت کو حاصل ہے، قرآن وسنت کے خلاف کسی قسم کی قانون سازی نہیں کی جاسکتی اسلام اپنے متبعین کو عہدہ طلبی اور عہدہ کے حصول کے لیے مال خرچی اور ذاتی تشہیر کی بھی اجازت نہیں دیتا۔اسلام نے محض پارٹی پالیسی کی بنیاد پر کسی مسئلہ کی حمایت یا مخالفت کو جائز قرار نہیں دیا ہے بلکہ ہر معاملہ کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھنے اور اسے اسی کی روشنی میں اپنا موقف اختیار کرنے کی تاکید کی ہے خواہ وہ موقف پارٹی پالیسی کے موافق ہو یا متصادم، اسلام میں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

پاکستان میں طرز حکمرانی

پاکستان میں پارلیمانی جمہوری نظام رائج ہے جہاں سپریم پاور پارلیمان ہے اور یہ نظام اپنی اصل شکل میں قائم نہ ہونے کے باعث عوامی خدمت کے بجائے محض حصول اقتدار کا ذریعہ ہی بن کر رہ گیا ہے اور سیاسی پارٹیوں میں داخلی سطح پر بھی جمہوری کلچر رائج نہیں ہے اور سیاسی افراد بھی اپنے آپ کو جمہوری سسٹم کے تابع کرنے میں تاحال ناکام دکھائی دے رہے ہیں اور اقتدار محض چند افراد کی حکمرانی کا نام بن کر رہ گیا ہے اور اقتدار کا مقصد حکومتی وسائل پر قبضہ اور اس کی آڑ میں اپنے مفادات حاصل کرنا ہی رہ گیا ہے چنانچہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب پاکستانی نظام جمہوریت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: جمہوریت کے لیے شہریوں کا انداز جمہوری ہونا ضروری ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ حکمرانوں کا طریقہ کار اور طرز حکمرانی جمہوری ہو، قانون کی حکمرانی قائم ہو، قومی ادارے مضبوط ہوں اور مواخذہ بطور نظام قائم ہو مگر پاکستان میں جمہوریت مجبوریت کا روپ دھار چکی ہے جس کا مقصد عوام کو اقتدار سے دور رکھنا ہے، ملک میں افراد آئین سے زیادہ طاقتور ہیں، وسائل حکومت پر مخصوص افراد قابض ہیں۔[20] جب کہ پاکستانی طرز سیاست کے بارے میں مفتی منیب الرحمن کا کہنا ہے: ہماری سیاست گری بھی حد درجہ خوار ہے، ایک دوسرے کی تذلیل کا بازار گرم ہے سیاست میں دشنام کے ماہرین کی مانگ زیادہ ہے اقدار تباہ ہو چکی ہیں، اپنی عزت بچانے سے زیادہ دوسروں کی تذلیل کرتے راحت محسوس کی جارہی ہے اور قوم کے لیے ماحصل شرمندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"[21]۔

---

[18] القرضاوی، یوسف، الدین والسیاسہ (المجلس الاوربی للافتاء والبحوث، دبلن 2007)، 149-151

[19] عثمانی، تقی مفتی، اسلام اور سیاسی نظریات، 261۔

[20] القادری، طاہر ڈاکٹر، پاکستان میں ممکنہ تبدیلی ضرورت اہمیت اور ممکنہ راستے (اشاعت اول: 2012)35-36۔

[21] منیب الرحمن مفتی، مشمولہ مضمون اسلام جمہوریت اور پاکستان، تاریخ اشاعت 10-12-2020

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

پاکستان میں تیس سال سے زیادہ عرصہ جمہوریت کے بجائے آمریت رہی ہے اگرچہ یہ ادوار اپنی ساخت میں پارلیمانی سسٹم کے بجائے صدارتی نظام کے قریب رہے ہیں بعض شعبہ جات اس عرصہ میں ترقی کی راہ پر گامزن دکھائی دیے مگر مجموعی ملکی صورت حال زبوں حالی کا شکار ہی رہی ہے غیر جمہوری دور میں ریاستی اداروں کا کام عوامی فلاح و بہبود کے بجائے آمر کی شخصیت کو ابھارنا اور اس کی حفاظت رہ جاتا ہے اقتدار اور طاقت ایک شخص میں جمع ہو جاتی ہیں اور استعماری قوتوں کو آمر سے ڈیل کرنا اور اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال میں لانا مزید آسان ہوتا ہے اور ایسے غیر سیاسی حکومتی نظام کے متعلق مشہور ماہر تاریخ ڈاکٹر اکبر علی شاہ لکھتے ہیں: فوجی حکومتوں نے دساتیر معطل کیے، حصول اقتدار پر قابض ہونے کے لیے اپنی جماعتیں قائم کیں نئے سیاسی نظام متعارف کروائے جنرل ایوب بنیادی جمہوریت کا کلچر لے کر آئے ضیا الحق نے سسٹم کے اسلامائزیشن کی بات کی، جنرل مشرف نے اعتدال پسندی کو متعارف کروایا تبدیلی ان سارے ادوار میں وقتی رہی اور ان شخصیات کی اقتدار سے دوری کے بعد رخصت ہوئی[22]۔ جب کہ اس حوالے سے پاکستان کے بزرگ سیاستدان جناب قاضی حسین احمد مرحوم کا کہنا ہے: فوجی مداخلت کا سب سے پہلے شکار عدلیہ ہوتی ہے، دستور معطل ہو جاتا ہے، عدلیہ کو یرغمال بنا دیا جاتا ہے، غیر دستوری اور غیر جمہوری مداخلت کی حمایت ہوتی ہے اس مسلسل غیر جمہوری عمل کے باعث عدلیہ کا ادارہ دم توڑ گیا ہے[23]۔

پاکستان میں انتخابی نظام

پاکستان میں اقتدار کی منتقلی انتخابات کے ذریعہ ہوتی ہے انتخابات کا نظام ملک میں تقریباً ۱۹۷۰ سے رائج ہے جو کہ تاحال بہت ناقص ہے اور اس مین بہت بہتری کی گنجائش ہے، انتخابات پر بے تحاشہ مالی مصارف اٹھتے ہیں، مال کے بل بوتے پر نااہل اور نکمے افراد عام طور پر منتخب ہوتے ہیں انتخابات کی شفافیت پر تو ہمیشہ سے سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں انتخابات سے پہلے، انتخابات کے دن اور انتخابات کے بعد ووٹوں کی گنتی کے دوران میں دھاندلی کے ذریعہ انتخابی نتائج بدلنے کا رواج پاکستان میں ہمیشہ سے رہا ہے۔[24] انتخابی سیاست اور فسادات کے نتیجہ میں ملک دولخت ہوا ایسا دکھائی دیتا ہے کہ پاکستان کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ صاف و شفاف انتخابات کا انعقاد ہے اور اس حقیقت کا اعتراف صفدر صدیقی نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''ہمارے نزدیک اہم مسئلہ جس پر دوسرے تمام مسائل کا حل اور ملک کی ترقی کا انحصار ہے وہ انتخابات کا یقینی طور پر آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انعقاد ہے۔ ہماری سیاسی اور انتظام حکومت میں جو خرابیاں آئی ہیں وہ انتخابات کو منصفانہ بنانے میں ہماری ناکامی کی وجہ سے ہیں ہمارے ملک کی بقا کا انحصار بھی منصفانہ انتخابات پر ہے''[25]۔ حالیہ عرصے میں چیف الیکشن کمشنر کا تقرر، وزیر اعظم پاکستان اور اپوزیشن لیڈر کے اتفاق رائے سے ہونا طے پایا ہے ضروری نہیں یہ لوگ آپس کی باہمی چپقلش اور سیاسی مفادات کی خاطر موزوں افراد کا انتخاب کر پائیں انتخابی قوانین بھی ناقص اور ادھورے ہیں مثال کے طور پر الیکشن کمیشن ایک امیدوار کو ایک سے زیادہ حلقوں سے الیکشن لڑنے کی اجازت دیتا ہے اور امیدار کے جیتنے کی صورت میں دوبارہ ایک سیٹ پر ضمنی انتخابات کے لیے کروڑں روپے کے مصارف اٹھتے ہیں الیکشن کمشنر نے الیکشن ضابطے کی خلاف ورزی پر کسی امیدار کو پانچ سال کے لیے نااہل کرنے کی سزار مقرر کی ہے انتخابی قوانین کی خلاف ورزی پر کم لوگ سزایاب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں الیکشن کمیشن نے اخراجات کی حد ایک نشست کے لیے ۱۰ لاکھ روپے مقرر کی ہے حالانکہ یہ اخراجات کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں الیکشن کمشنر امیدواران سے اخراجات کے ثبوت طلب کرتا ہے اور ان میں وہ اخراجات شامل نہیں ہوتے جو امیدواران کی جانب سے ان کے حلقوں میں دوسرے افراد کرتے ہیں الیکشن کمیشن نے انتخابات کے نام پر اٹھنے والے اخراجات کی جانچ پڑتال کے لیے بھی کوئی مناسب طریقہ کار واضح نہیں کیا ہے انتخابی قوانین اور ان کے نتائج کے متعلق فاضل کالم نگار، آصف محمود صاحب کا کہنا ہے: ''انتخابی قوانین ناقص، ادھورے

---

[22] مبارک علی، ڈاکٹر، مارشل لا کے سماج پر اثرات، سہ ماہی شمارہ 39، 126-127۔

[23] حسین احمد، قاضی، اسلام مسلمان اور پاکستان (اسلامک پبلی کیشنز لاہور، 2009)، 127-128

[24] نظامی، قیوم، منظر نامہ، کالم کا عنوان: شفاف انتخابات کے تقاضے، روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۳ دسمبر ۲۰۲۳۔

[25] صدیقی، صفدر، پاکستان کی تعمیر نو (نگارشات لاہور، 1992)، 218۔

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

اور نامعتبر ہیں اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے انتخابات کے بعد ہیجان تھمنے کے بجائے بڑھ جاتا ہے۔ جب تک ان قوانین میں معنوی تبدیلی نہیں لئی جاتی نہ جمہوریت مستحکم ہو سکتی ہے اور نہ انتخابی عمل معتبر ہو سکتا ہے"[26]۔ ملک میں عام انتخابات ۸ فروی ۲۰۲۴ کو ہونا طے ہیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی تقریبا ۸۵۹ نشستوں پر انتخابات ہو رہے ہیں۔ ان انتخابات کے لیے ۹۱ ہزار پولنگ سٹیشنز قائم کیے گئے ہیں۔ رجسٹرڈ ووٹوں کی تعداد تقریبا ۱۲ کروڑ بتائی جارہی ہے جن میں چھ کروڑ پچاسی لاکھ آٹھ ہزار مرد جب کہ خواتین ووٹرز کی تعداد پانچ کروڑ چوراسی لاکھ بہتر ہزار اور چودہ ہے[27]۔ الیکشن کمیشن نے حالیہ الیکشن کے لیے ۵۸ ارب روپے الیکشن ڈے پر خرچ ہونے کا تخمینہ دیا ہے۔ جب کہ الیکشن کمیشن کے تنخواہوں کی مد میں ماہانہ بنیادوں پر اٹھنے والے مصارف الگ سے ہیں۔ مروجہ طریق انتخاب میں الیکشن لڑنے کے لیے ایک امیدوار کو کروڑوں روپے کا سرمایہ درکار ہوتا ہے جس کے باعث اہل علم، محب وطن اور دیانتدار افراد مالی کمزوری کے سبب عموما انتخابات میں حصہ نہیں لے پاتے یہ اور اگر کسی طور پر حصہ لے بھی لیں تو ان کے انتخابات جیتنے کے امکانات کم ہوتے ہیں اور یوں پیسے کے بل بوتے پر نااہل اور نکمے افراد زیادہ تر اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور ملک کے مسائل حل کرنے میں نہ ان افراد میں کوئی خاص دلچسپی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی یہ لوگ زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں چنانچہ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر امین پاکستانی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: پاکستان میں سیاست فل ٹائم پیشہ بن گیا ہے، سیاست کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے اور سرمایہ کی بنیاد پر جاگیر دار اور سرمایہ کار ہی سیاست کرتے ہیں کامیاب ہونے کے لیے جائز و ناجائز طریقوں سے مال جمع کرتے ہیں کامیاب ہونے کے بعد ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے اخراجات مع سود وصول کریں[28]۔ جبکہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کا ملکی انتخابی سیاست کے بارے میں یہ موقف ہے: پاکستان میں موروثی سیاست ہے جو لوگ قیام پاکستان سے پہلے سیاست واقتدار کا حصہ تھے سیاست واقتدار اب بھی انہی کے خاندانوں میں ہے فوجی حکومتیں ہوں یا جمہوری اقتدار ہمیشہ انہی خاندانوں میں ہی رہا ہے آج قومی اسمبلی کا ایک انتخاب ۲۰ کروڑ سے کم سرمایہ پر نہیں لڑا جاسکتا جو شخص اتنی رقم خرچ کر کے الیکشن لڑتا ہے وہ ملک میں تبدیلی کیسے لائے گا؟ اسے تو اپنے مفادات زیادہ عزیز ہوتے ہیں کئی سال پہلے مجھے ایک شخص نے بتایا کہ اس نے الیکشن پر ایک ارب روپیہ خرچ کیا ہے اس شخص نے کہا کہ اس نے خرچ کی ہوئی یہ رقم واپس لینی ہے، آئندہ انتخابات کے لیے جب اخراجات بہت بڑھ چکے ہوں گے ان کے لیے سرمایہ بھی جمع کرنا ہے ایسا شخص ان حالات میں قوم کا نمائندہ کیسے ہوگا؟[29]۔

تبدیلی کے ممکنہ راستے

پاکستان بدانتظامی اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے، حکومتیں عوامی مسائل حل کرنے میں تاحال ناکام ہیں، بے روزگاری اور غربت میں ہوشربا اضافہ ہو گیا ہے اگرچہ پاکستانی آئین کا تقاضا ہے کہ ملکی قوانین قرآن وسنت کے منافی نہ بنائے جائیں اسلامی نظریاتی کونسل کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قوانین کو اسلامیانے کے عمل میں حکومت کو سفارشات پیش کرے مگر ان سفارشات پر پارلیمنٹ کے لیے عمل لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے علاوہ ازیں شریعت کورٹ کو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے غیر اسلامی قوانین کا جائزہ لینے اور انہیں کالعدم قرار دینے کا بھی اختیار دیا گیا ہے اس ساری صورتحال کے باوجود پاکستان میں اسلامی نظام حکومت رائج نہیں ہے جہاں حکمران اپنی ذمہ داریوں کی بابت اللہ کے سامنے اور عوام کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھیں۔ دوسری جانب ملک میں مغربی طرز پر رائج جمہوری نظام بھی نقائص سے خالی نہیں ملکی نظام بہتری کی جانب کیسے گامزن ہو سکتا ہے؟ مختلف مکاتب فکر کے علماء نے مروجہ سیاسی نظام کی بہتری کے لیے ممکنہ راستے تجویز کیے ہیں ہم پہلے تبدیلی کے ممکنہ چند راستوں کا اختصار سے ذکر کرتے ہیں بعد ازاں تبدیلی کے ان مجوزہ طریقوں

---

[26] محمود آصف، روزنامہ ۱۹۲ اسلام آباد، کالم کا عنوان: انتخابی قوانین اور جمہوری آمریت، تاریخ ۲۷ مئی ۲۰۲۳۔

[27] اداریہ ڈیلی آج، اسلام آباد، ۷ دسمبر ۲۰۲۳۔

[28] امین ڈاکٹر احمد۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ ایک مطالعہ (پنجاب یونی ورسٹی لاہور)، 150-159۔

[29] القادری، طاہر ڈاکٹر، پاکستان میں ممکنہ تبدیلی ضرورت اہمیت اور ممکنہ راستے، ۳۱۔ ۳۲۔

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

پر تبصرہ کرتے ہوئے سیاسی اور انتخابی اصلاح کا ہم اپنا ماڈل پیش کریں گے: علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کی رائے میں موجودہ سیاسی ڈھانچہ بہت کمزور ہے اور اس نظام میں بہتر افراد کا انتخاب اور بد حکومتی کا خاتمہ کسی صورت ممکن نہیں ہے ضرورت ہے کہ ملک میں کچھ عرصے کے لیے غیر سیاسی اور غیر فوجی حکومت قائم کی جائے اس حکومت میں بے داغ کردار کے سیاستدان، ججز، افواج پاکستان، بیوروکریسی، سماجی اور مذہبی مصلحین شامل ہوں یہ افراد ملک کے سیاسی نظام میں بہتری لائیں اور اپنی نگرانی میں انتخابات کروائیں، مخلص اور دردمند افراد کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچا کر خود رخصت ہو جائیں[30]۔ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم صدارتی نظام کو اسلام کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں ان کے نزدیک انتخابی نظام موثر بنانا ناگزیر ہے ووٹر اور امیدوار کی کم از کم عمر چالیس سال مقرر ہونی چاہیے ووٹر کی تعلیم کی بھی کوئی حد مقرر ہونی چاہیے امیدوار ان کے کردار کو باریکی سے پرکھا جانا چاہیے مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کو الگ حیثیت دی جائے مقننہ قانون سازی کرے عدلیہ کو اختیار ہو کہ مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین کو کالعدم قرار دے دوسری طرف انتظامیہ ان قوانین کی تنفیذ کرے اور شہریوں کے حقوق کی پاسداری کرے اجتہاد کا حق پارلیمنٹ کو ہی سونپا جائے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کیسے اسلام کے مطابق ہوں؟ڈاکٹر صاحب کا اس بارے میں موقف ہے کہ ایک طرف تو کوئی قانون اسلام کے خلاف بنایا ہی نہ جائے دوسری طرف پارلیمنٹ میں وہی لوگ جائیں جو اسلام کا معتدبہ حصہ حاصل کر چکے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ پارلیمنٹ سے ہٹ کر علماء کا ایک ادارہ بنایا جائے وہ جو بل پارلیمنٹ میں زیر غور ہو اس کے بارے میں یہ ادارہ فیصلہ کرے کہ یہ شریعت کی حدود میں ہے یا شریعت کی حدود سے خارج ہے۔ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ اجتہاد کا اختیار تو پارلیمنٹ کے پاس ہی رہے لیکن خالص علمی اور فنی معاملات فیصلہ سازی کے لیے اعلی عدلیہ کے سپرد ہوں[31]۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کی رائے میں انتخابات کی خواہش رکھنے والے افراد کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے حلقوں کی نمائندگی کے لیے اپنے آپ کو خود تجویز کریں بلکہ ایسا نظام ترتیب دیا جائے کہ انتخابی عملہ مختلف حلقوں میں جا کر خود جانچ پڑتال کرے اور حلقے کی نمائندگی کے لیے موزوں افراد کی فہرست تجویز کرے وہ اس بابت باقاعدہ سے ان افراد کی اہلیت کے لیے سوالنامہ بنائے جس میں ان کی تعلیمی قابلیت، سماجی خدمات، کردار اور تجربے کے بارے میں ضروری اوصاف طے ہوں الیکشن کمیشن ان ساری باتوں سے مطمئن ہو کر ان افراد کے کاغذات نامزدگی کے لیے منظور کرے پھر ان افراد کے درمیان انتخابات کے لیے ووٹ ڈلوائے جائیں قانون سازی کے متعلق مفتی تقی عثمانی صاحب کا موقف ہے کہ تمام قوانین احکام اور عدلیہ کو مدون کر کے دیے جائیں اور انہیں ان کے تحت فیصلے کرنے اور ان پر عمل درآمد کا پابند کیا جائے اور اس طرح کی قانون سازی کے لیے علماء اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین بھی شامل ہوں ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدون قوانین احکام اور عدلیہ کو سپرد کرنے کے بجائے عدالتوں پر لازم کیا جائے کہ وہ تمام فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کریں جو معاملات اسلامی تعلیمات کی روح سے مباحات کے درجہ میں ہیں ان قوانین کے متعلق پارلیمنٹ خود قانون سازی کرے لیکن ان قوانین کے نفاذ سے قبل علماء شریعت کو ان کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا جائے تاکہ ان میں خلاف شریعت جزئیہ داخل نہ ہو سکے[32]۔مولانا زاہد الراشدی کی رائے میں ملک میں جاری سیاسی کشیدگی کا حل دو طریقوں سے ممکن ہے ایک انتخابات اور سیاسی عمل کے ذریعے دوسرا مقتدر حلقوں سے لڑائی سے۔یہ دونوں راستے مولانا کی رائے میں درست نہیں ہیں ان کے نزدیک تبدیلی کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد اور سٹریٹ پاور ناگزیر ہے اور ان کی نظر میں اس بابت ایرانی تجربہ سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے ایرانی مذہبی قیادت نے ایرانی تعلیمی اداروں کو اپنی فکری بیداری کی جو لانگاہ بنایا ہاتھ اٹھائے بغیر تحریکی قوت اور سٹریٹ پاور کے ذریعے شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور نیا سیاسی نظام ایران میں متعارف کروایا۔[33]

---

[30] ایضا، پاکستان میں حقیقی تبدیلی کیوں اور کیسے (سن اشاعت ۲۰۱۲)، 43۔

[31] احمد، اسرار ڈاکٹر، پاکستان میں نظام کیا کیوں اور کیسے (مکتبہ خدام القرآن لاہور، طبع اول جنوری ۲۰۰۱)، 13- 24۔

[32] عثمانی، تقی مفتی، اسلام اور سیاسی نظریات، 276-277۔

[33] زاہد الراشدی مولانا، مشمولہ مضمون اسلامی نفاذ کی جدوجہد اور اس کی حکمت عملی، مجلہ ماہنامہ شریعہ گوجرانوالہ تاریخ اشاعت فروری ۲۰۱۳۔

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2023)
(October- December)

جہاں تک بات ملک میں کچھ دورانیہ کے لیے غیر سیاسی حکومت قائم کرنے کی ہے جو اپنے زیر نگرانی شفاف الیکشن کروائے ہماری رائے میں پہلے تو پوری قوم کو اس موقف پر جمع کرنا مشکل ہے دوسرا ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں یہ مشکل دکھائی دے رہا ہے کہ ایسے افراد مکمل دیانتداری کے ساتھ قومی امانت قوم کے اہل افراد کے سپرد کر کے بآسانی اقتدار کے ایوانوں سے رخصت ہوں دوسرا یہ نقطہ نظر کہ الیکشن کمیشن خود امیدواران کا انتخاب کرے ان حالات میں جب کے ملک کی آبادی ۲۵ کروڑ کے قریب ہے یہ عمل خاصا مشکل لگ رہا ہے دوسرا پاکستانی عوام میں علاقائی، قبائلی، سیاسی اور مسلکی تقسیم اس قدر گہری ہے کہ قوم کے غیر متنازعہ اور متفق نمائندوں کا چناؤ اس طریقہ کار سے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پرامن سیاسی تحریک اور سٹریٹ پاور کے ذریعہ ملک کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ تبدیل کیا جاسکتا ہے یہ بات بہت حد تک مناسب دکھائی دیتی ہے فی الحال مذہبی جماعتوں میں ایسی کرشماتی شخصیت دور تک دکھائی نہیں دے رہی جس پر ساری مذہبی جماعتیں متفق ہوں اور عامۃ الناس بھی اس شخص کی قیادت پر سیاسی جدوجہد کے لیے اظہار اعتماد کریں۔ ہم ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں کہ صدارتی نظام اسلام کے زیادہ قریب ہے اور تجویز کرتے ہیں کہ ملک میں صدارتی نظام نافذ العمل ہونا چاہیے ملک میں جاری سیاسی مسائل کا حل صدارتی نظام میں ہے صدارتی نظام میں صدر اپنی مرضی سے کابینہ تشکیل دے سکتا ہے، لائق فائق، قابل اور اہل افراد کابینہ کا بآسانی حصہ بن سکتے ہیں، اس نظام میں قانون سازی بھی آسان ہے اس سسٹم سے انتخابات کے نام پر جاری کھیل تماشہ اور انتخابات پر اٹھنے والے بے تحاشہ اخراجات کا خاتمہ یقینی ہے۔

سربراہ مملکت اس نظام میں پارلیمانی سسٹم میں وزیر اعظم کی نسبت زیادہ بااختیار ہوتا ہے ہماری رائے میں صدارتی نظام کو فعال بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس بابت سارے قوانین مدون ہوں صدر کی مدت اور اس کے اختیارات طے ہوں الیکشن کمیشن دیانتدار اور غیر جانبدار افراد پر مشتمل ہو اور اپنے فیصلوں میں مکمل آزاد ہو صدر کے عہدہ لیے الیکشن کمیشن موزوں افراد کے کاغذات نامزدگی کے لیے منظور کرے، پھر ان افراد کے درمیان صدرارتی انتخابات ہوں انتخابات میں محض گریجویٹ ووٹرز سے ووٹ ڈلوائے جائیں صدارتی انتخابات میں اخراجات دس بیس لاکھ سے زیادہ نہ کیے جائیں انتخابات جیتنے والے فرد کو معین مدت کے لئے صدر بنایا جائے صدارتی نظام کو اسلامی نظام حکومت کے قریب لانے کے لیے مناسب ہے کہ تمام اسلامی جماعتیں باہمی تعاون سے ایک اسلامی جماعت تشکیل دیں اور اپنا مشترکہ امیدوار صدارت کے لیے نامزد کریں مجلس شوری کی ہیئت، شکل و اختیارات طے ہوں الیکشن کمیشن مجلس شوری کے افراد کے کاغذات نامزدگی کے لیے منظور کرے اور گریجویٹ ووٹرز کے ووٹوں سے مجلس شوری کے افراد کا تقرر ہو اور مجلس شوری کو سینٹ اور قومی اسمبلی کے قائم مقام ادارہ بنایا جائے انتظامی معاملات میں صدر مملکت کو شوری کی رائے کا پابند نہ کیا جائے اور قانون سازی میں صدر کے لیے شوری کے فیصلوں کی پابندی لازمی قرار دے دی جائے۔ قانون سازی کا اختیار تو شوری کو ہی حاصل رہے البتہ شرعی معاملات میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے پر عمل درآمد ضروری قرار دیا جائے ملک کی بقا اور استحکام کے لیے ناگزیر ہے کہ عدالتی نظام میں اصلاحات لائی جائیں تاکہ عدالتیں اپنی مرضی سے آئین اور شریعت کے تابع رہ کر بلا تفریق اپنے فیصلے صادر فرمائیں۔